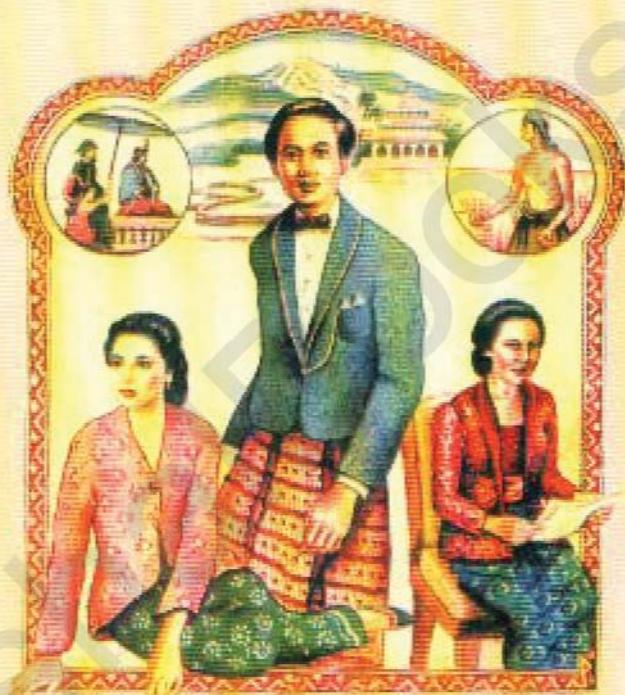


دھرتی کے دکھ

اندو نیشی ناول



پرمود یہ آنند طور

ترجمہ: تنویر اقبال



مشعل

دھرتی کے دکھ (انڈونیشی ناول)

پر مددیہ آنند طور

ترجمہ: تنویر اقبال

مشعل

آر-بی 5، سینئنڈ

فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور 54600، پاکستان

دھرتی کے دکھ

پرمد دیہ آنند طور

ترجمہ: تنور اقبال

کالی رائٹ © انگریزی پرمود دیہ آنند طور، 1975

کالی رائٹ © اردو۔ مشعل، 2000

ناشر: مشعل

آر-بی 5، سینئر، فلور، عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،
لاہور 54600، پاکستان

فون فیکس: 042-35866859

E-mail: mashbks@brain.net.pk

پیش لفظ

بیسویں صدی کا سورج طلوع ہوتے ہی، آزادی اور خود مختاری کی ایک ایسی عظیم لہر اٹھی جس نے آنافانا پورے کرہ ارض کو اپنی پیٹ میں لے لیا۔ سامر ابی قوتیں جدید علوم اور ذرائع پیداوار کی ترقی کا ہتھیار لئے پوری دنیا میں دنمناتی پھر رہی تھیں۔ بظاہر تبدیلی کی، تاحد نظر، کوئی جھلک نظر نہیں آتی تھی۔ پورا ایشیا اور افریقہ غلامی کی زنجروں میں جکڑا ہوا، جبر و استبداد کے آگے اپنی مجبور و مقہور قسمت پر آنسو بہانے کے سوا کچھ بھی نہ کر پا رہا تھا۔ ایسے میں نواز بادیاتی طاقتوں کے باہمی تضادات نے جنم لیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شدت کی انتہا پر جا پہنچ۔ نتیجہ پہلی اور دوسری عالم گیر جنگوں کی صورت میں تکلا۔ ان جنگوں نے نواز بادیاتی طاقتوں کو اس درجے پر بس کردا لا کہ انہیں اپنے مقویات کو چھوڑتے ہی بن پڑی۔

یہ ناول اس دور سے ذرا پہلے کی کہانی ہے۔ اندونیشیا کے پس منظر میں لکھا گیا یہ ناول پرمودیا آند طور کی زندگی کی ابتدائی یادداشتوں پر مشتمل ہے۔ ایک روشن خیال اور آزادی پسند لکھاری کے طور پر، خصوصاً ایک غلام سماج کے فرد کی حیثیت سے، انہوں نے اپنے سامنے پھیلی ہوئی اور خود بیتی حقیقتوں کو خوبصورت افسانوی انداز دینے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ چھلی صدی کی ابتداء میں اردو ادب جن لایتی اخلاقی حدود اور معاشرتی پابندیوں کا شکار نظر آتا ہے (اور غالباً اسی لئے اردو زبان میں ابھی تک غلام صدیوں میں کئے گئے نواز بادیاتی مظالم کی کوئی مستند تاریخ یا داستان نظر نہیں آتی) اندونیشی تحریروں میں ایسی کوئی ناروا اور خود ساختہ پابندیاں سرے سے نظر نہیں آتیں۔

بدی یہ حکمرانوں کی خباثت انگیز حرکات اور جبر و تشدد کی ہر شکل مصنف کے ہاتھوں، بلا کم و

کاست لفظوں کی تصویر میں ڈھل جاتی ہے۔ کتاب کا مصنف ناول میں واحد متكلم کا صیغہ استعمال کرتے ہوئے جہاں بدیکی نظام کی خیتوں اور مظالم کے سامنے سینہ پر دکھائی دیتا ہے، وہاں وہ ماضی کے گمراہ کن جاہوجلال، اجداد پرستی اور معاشرتی توهہات کا بھرپور مذاق اڑانے سے بھی نہیں چوکتا۔

نوجوان طالب علم کی حیثیت میں، غالباً وہ واحد بدیکی لڑکا ہے، جس کا کوئی خاندانی نام نہیں مگر وہ اس پر شرمندہ ہونے کے بجائے، محنت اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے، یورپی اور مخلوط انسل طلبہ کے درمیان اپنا مقام منوانے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ممکنی اس کا عرفی نام ہے جو (بقول اس کے) اس کے کسی استاد نے غصے میں اسے ممکنی (اگریزی میں بندرا مترادف) کہتے کہتے، ممکنی میں بدل دیا تھا لیکن وہ کسی خجالت کا سامنا کرنے کے بجائے، اپنی اسی عرفیت کے ذریعے، اپنی ذہنی اور علمی برتری کا احساس دلاتا ہے۔

بغاوٹ شاید اس کی فطرت ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی، اپنی ماں کے سوا کسی سے نہیں بنتی۔ وہ اپنے باپ کی حاکمانہ ذہنیت اور بدیکی حکمرانوں کے طور طریقوں کو باہم مماثل پاتاتا ہے۔ تاریخ پر اس کی گہری نظر ہے۔ وہ یہ کہتے ہوئے قطعی نہیں شرماتا کہ اس کے آباؤ اجداد نے اپنے ذاتی اغراض و مقاصد کی خاطر، قومی مفادات کا ڈچ نوآباد کاروں کے ہاتھ بڑا استاسودا کر لیا تھا۔

تاریخ کے اوراق کو اگر راز بسیدگی سے ٹھولا جائے تو پہنچتا ہے کہ سڑھویں اور اٹھارویں صدی کے زیادہ تر ایشیائی معاشرے صنعتی اور زرعی اعتبار سے خود کفیل اور خاصے منضبط تھے۔ یورپ میں تحریک احیائے علوم اور صنعتی انقلاب کے کیے بعد دیگرے پہاڑوں کے بعد، نوآبادیاتی پھیلیا ایک تاریخی جبرا (یہ اور بات کہ اس کا نشانہ ہمیں بننا پڑا) سفید فام اقوام کو ایک طرف اپنی بڑھتی ہوئی صنعتوں کے لئے خام مال درکار تھا اور دوسرا جانب صنعتی پیداوار کے لئے منڈیوں کی تلاش۔ یہ دونوں کام ابتداء میں ان کے ہم جو اور طالع آزمگروہوں نے انفرادی طور پر کرنے کی کوشش کی۔ اٹھارویں صدی کے وسط تک ایسٹ اٹھیا کمپنی نے پورے بنگال میں تجارتی اجارتہ داری قائم کر لی تھی۔ مراءات تو انہیں اور نگزیب کے آخری دور میں ہی حاصل ہو گئی تھیں مگر اس کے جانشینوں نے انہیں ہر طرح کے پیکس کی ادائیگی سے ہی آزاد کر دیا۔ مقامی لوگوں کو اپنی پیداوار پر پیکس ادا کرنے پڑتے تھے۔ جن سے ان کی پیداواری لاغت بہت زیادہ ہو جاتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی صنعت کمکمل طور پر تباہ ہو کر رہ گئی۔ یہی حال جزاً اٹھیا نیشا میں ہوا، وہاں ڈچ انڈریز کمپنی

نے گئے اور چینی کی پیداوار صرف سفید فاموں کے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ زرخیز ترین زمینیں مقامی لوگوں سے انہتائی کم کرائے پر حاصل کر لی جاتیں اور ان کے حصول کے لئے ہر نازیبا حرbeh استعمال کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا گیا۔

اس داستان میں نیایے اونتو ساروہ کا کروار اس جبر کی واضح مثال نظر آتا ہے۔ وہ ایک سفید فام کی دوسری بیوی (ڈچ اسے غیر قانونی شادی سمجھتے تھے) ہونے کے باوجود، اپنی سالہا سال کی شدید محنت سے قائم کردہ کپنی اور جائیداد ایسے سفید فام وارثوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے، جو ہزاروں میل دور دوسرے برا عظم میں موجود ہیں۔

چھپلی صدی میں نوآبادیات کا ادب اور داستان بھر پور مزاحمت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں مگر اس طرح کا ہندوستانی معاشرہ ایسا کوئی مزاجتی ادب تخلیق نہیں کر پایا۔ یہ بات نہیں کہ یہاں مزاحمت تھی، ہی نہیں بلکہ ہمارے ادیب اور شاعر قلمہ مغلی کے دروازے بند ہونے کے بعد، اظہار و فادری یا ملاش ملازمت میں انگریزی دربار کے طواف کرنے میں مصروف تھے۔ سید احمد خان "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر سر کا خطاب پار ہے تھے اور مرزاغالب، اپنی پٹشن کے دوبارہ اجر کے لئے یہ کہہ رہے تھے کہ "حضور میں آدھا مسلمان ہوں کیونکہ شراب پیتا ہوں مگر سور نہیں کھاتا"۔

انگریز، ڈچ سے بہت زیادہ ہوشیار اور عقائد تھا۔ جہاں آدمی گڑ سے مر جائے، وہاں زہر کی کیا ضرورت۔ سو انگریز نے گڑ کا بے دریغ استعمال کیا اور دوسری جانب ہماری خود فیل میഷتوں کے خون کا آخری قطرہ تک پینے کی کوشش کر دی اور ہمیں خام مال پیدا کرنے والی زرعی معیشت بنا کر رکھ دیا۔ ہر حال ان حقائق کا تجزیہ کرنا معیشت دانوں اور مورخوں کا کام ہے، ہمارا نہیں۔ ہم تو سمندر میں صرف کنکریاں مار سکتے ہیں۔ اپنے پانیوں میں ارتعاش پیدا کرنا تو سمندر کی مرضی پر منحصر ہے۔

تowriq اقبال

باب 1

لوگ مجھے منکی کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ میرا اپنا نام کیا ہے، فی الحال بتانے کی ضرورت نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے اپنا آپ چھپانے میں کوئی مزہ آتا ہے، بارہا میں نے اس بارے میں سوچا ہے۔ دراصل ابھی میں خود کو لوگوں کی نظر و میں لانا نہیں چاہتا۔

شروع میں، جب میں یہ مختصر نوٹس لکھ رہا تھا تو شدید قتوطیت مجھ پر طاری تھی۔ وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی۔ کون جانے یہ جداںی عارضی تھی یادا کی۔ (میں اس وقت حالات کے بدلتے رخ سے قطعی لاعلم تھا) کبھی ختم نہ ہونے والا دکھ اور خوف، آس اور یاس کے درمیان ہلکوڑے کھاتا مستقبل، سربستہ راز! ہم چاہیں یا نہ چاہیں اپنی جسم و جاں سمیت اس سمت میں چلتے جانا ہے اور حالات کا جبرا کشرا واقعات ہمارے ساتھ ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی بالآخر یہی ہوا، قدرت مہربان ہوتی ہے یا بے اعتنائی برتی ہے، اس کی مرضی لیکن انسانیت کو عموماً ایک ہاتھ سے تالی بجنا پڑتی ہے۔ تیرہ سال بعد، مجھے ان نوٹس کو دوبارہ پڑھنے کا موقع ملا۔ میں نے ان میں اپنے خوابوں اور تصورات کا رنگ بھرا تو ان کی شکل ہی مختلف ہو گئی۔ مختلف؟ آہ! لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے! بہر حال واقعات کچھ اس طرح پیش آئے:

باب 2

اوائل جوانی میں ہی علم و آگہی کا جو تجربہ مجھے نصیب ہوا، الفاظ اس کی خوبصورتی بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمارے سکول کے ڈائریکٹر نے ایک دفعہ پوری کلاس کے سامنے کہا تھا: "آپ کے اساتذہ نے عمومی معلومات کا اتنا وسیع اور بے بہانہ آپ کو دیا ہے جو شاید یورپ کے بہت سے ملکوں میں بھی اس درجے کے طلبہ کو حاصل نہیں ہوا ہوگا"۔

ظاہر ہے، میں خوشی سے پھول کر کپا ہو گیا، میں کبھی یورپ نہیں گیا تھا۔ ڈائریکٹر کی بات صحیح تھی یا غلط، مجھے پتہ نہیں تھا۔ بات میرے دل کوئی سویں نے اس پر یقین کر لیا۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ میرے تمام اساتذہ یورپ میں ہی پلے بڑھے تھے اور ان کی تعلیم و تربیت بھی وہیں ہوئی تھی۔ اساتذہ کی بات پر یقین نہ کرنا بھی کوئی مناسب نہیں لگتا۔ میرے والدین نے مجھے ان کے حوالے کیا تھا اور یہ لوگ اپنے علم و مرتبے کے اعتبار سے جزاً میں موجود یورپی اور مقامی تعلیم یافتہ طبقے میں متاز حیثیت کے حامل تھے چنانچہ مجھے ان پر اعتبار کرنا ہی تھا۔

سکول کی تعلیم و تربیت، جس کے اثرات کا میں نے علمی زندگی میں خود مشاہدہ کیا، نے میری شخصیت کو میرے ہم وطنوں کے عمومی رنگ ڈھنگ سے بالکل ہی مختلف رنگ دے دیا۔ پتہ نہیں مجھے اس کا نقصان ہوا یا فائدہ، جاواہی رہن سہن اور مغربی تربیت کے ملے جلے تجربے نے ہی شاید مجھے یہ نوٹس لکھنے کی عادت ڈالی تھی ممکن ہے کبھی یہ کسی کام آ جائیں۔

پرمنگ خصوصاً جستی چھپائی سائنس کی وہ دویعت ہے جس پر میں ہمیشہ عش عش کرتا ہوں۔ تصور کیجئے۔ کسی بھی تصویر کی لاکھوں کا پیاس ایک ہی دن میں بنائی جا سکتی ہیں۔ خوبصورت مناظر، بڑی اور اہم شخصیات، نئی مشینوں اور فلک بوس امریکی عمارتوں کی تصاویر، غرض دنیا کے ہر کونے کی ہر چیز، میں ان چھپے ہوئے کاغذات کے ذریعے خود دیکھ سکتا تھا۔ مجھ سے پچھلی نسل کتنی ہی داماں تھی، اپنے ہی گاؤں کے کچے راستوں پر، اپنے ہی پیروں کے خلط ملط نشانات میں گم!

ان عجائب کے خالقون اور ان کے لیے کام کرنے والے انھک کارکنوں کا میں تدل سے ممنون ہوں۔ ابھی پانچ سال پہلے تک چھپی ہوئی تصاویر کی بجائے صرف بلاک اور لیتھوگراف چھپائی کا رواج تھا جن سے حقیقت کی عکاسی ممکن نہیں تھی۔

جدید ترین دریافتتوں کا لفظ یورپی اور امریکی روپروٹوں کے ذریعے ہم تک پہنچا، ان دریافتتوں کی شان و شوکت کے آگے دیوی، دیوتاؤں، سور ماوں اور وے یا نگ میں میرے اجداد کا جاہ و جلال ماند پڑتا نظر آ رہا تھا۔ ریل گاڑیاں۔۔۔ ایسی گاڑی جس میں گھوڑے ہیں نہ مویشی اور نہ ہی بیل۔۔۔ چلتے ہوئے، میرے ہم وطن دس سال سے تو دیکھی ہی رہے ہیں لیکن آج تک ان کی حیرت دو نہیں ہو پائی۔ بناویا اور سرا بیا کا فاصلہ صرف تین دن میں طے ہو سکتا ہے! اور لوگوں کا کہنا ہے کہ جلد ہی یہ سفر صرف ایک دن اور رات کا رہ جائے گا۔ ایک دن رات! بڑے بڑے مکانوں کی طرح بننے ڈیوں کی طویل گاڑی، لوگوں اور اشیاء سے لدی پھندی، صرف پانی کی قوت سے کھینچی جاتی ہے! اگر مجھے زندگی میں کبھی مشین سے ملنے کا موقع ملا ہوتا تو میں یقیناً اسے رنگارنگ چھولوں کا گلستہ پیش کرتا، میرے جزیرے جاوائیں، ریل کی پیڑیوں کا ایک جال بچھ گیا۔ ریلوں کا گاڑھادھواں میرے وطن کے آسمان کو سیاہ کرتا ہوا، خلاکی و سعوقوں میں کہیں گم ہو جاتا۔ یوں لگتا تھا جیسے دنیا کے آگے فاصلوں کی کوئی اہمیت ہی نہیں رہی۔ ٹیلی گرام نے توفاصلوں کو ختم ہی کر دیا، طاقت پر ہاتھیوں اور گیندوں کی اجارہ داری کا خاتمہ ہو گیا۔ انسان کے ہاتھوں بنے ہوئے نہ، پیچ اور بولٹ ان کی جگہ لے رہے ہیں۔

اور اوہر یورپ میں لوگوں نے، بھاپ کے انجن چتنی طاقت کی، بلکہ اس سے بھی زیادہ طاقت کی چھوٹی چھوٹی مشینیں بنانا شروع کر دی ٹھیں۔ ان میں بھاپ کے بجائے تین استعمال ہوتا تھا۔ یہ بھی اڑائی جارہی تھی کہ کسی جرم نے بچلی سے چلنے والی کار بنا دی ہے۔ یا اللہ! ادھر میں ابھی تک بچلی کی ماہیت سے بھی ناواقف تھا۔۔۔ قدرتی مظاہر کی قتوں میں تبدیلی لا کر، ان سے انسانی خدمت کا کام شروع ہو چکا تھا۔ لوگ اڑن دیوتا گٹوٹ کا کی طرح ہوا میں اڑنے کی منصوبہ بندی کر رہے تھے۔ میرے ایک استاد نے کہا تھا: ”کچھ ہی عرصے کی بات ہے اور پھر معمولی معمولی کاموں کے لیے انسان کو اپنا خون پسینہ ایک نہیں کرنا پڑے گا۔ ہر کام مشینیں کیا کریں گی اور لوگوں کو عیش کرنے کے سوا کوئی کام نہیں ہو گا۔ تم لوگ بہت خوش نصیب ہو کہ ان جزاً میں رہتے ہوئے ایک نئے دور کی ابتداء کا مشاہدہ کرنے جا رہے ہو۔

جدید! حیرت ہے اس لفظ کی تیز رفتاری پر، کسی بیکیٹر یا کی طرح، بے تحاشا عدی
اضافے کے ساتھ پوری دنیا میں پھیل گیا۔ (کم از کم، لوگ تو یہی کہہ رہے ہیں) چنانچہ مجھے بھی
اس لفظ کا استعمال کرنے دیجئے اگرچہ میں ابھی اس کے مفہوم سے صحیح واقف نہیں۔ قصہ مختصر، اس
جدید دور میں کسی بھی فوٹو کی لاکھوں کا پیاس ہر روز بنائی جا سکتی ہے۔ اہم بات یہ تھی کہ اپنی بہت سی
تصویریوں میں سے ایک تصویر کو میں اکثر دیکھا کرتا تھا۔ تصویر کسی دو شیزہ کی تھی جس میں خوبصورتی،
دولت، طاقت اور کامرانی غرض ہر شے مجھنے ہو گئی تھی۔ شاید دیوتاؤں کی محبوب تھی وہ!

میرے سکول کے دوستوں میں یہ افواہیں، سرگوشی کے سے انداز میں، گشت کرتی نظر
آتیں: دنیا کا امیر تین بینکار بھی اس سے شادی کا نہیں سوچ سکتا۔ سر سے پاؤں تک ڈلکشی اور وقار
کا حسین امترانج تھی، دیکھنے کی چیز ہے، بس دیکھ جاؤ!

اپنے فارغ اوقات میں، میں عموماً اس کے چہرے پر نظریں گاڑ دیتا اور سوچوں میں گم ہو
جاتا: یہ ہو گا کیسے؟ کیا ہو گا؟ کتنی بلند حیثیت ہے وہ! تقریباً بائیس ہزار کلو میٹر کا فاصلہ ہے
ہمارے درمیان۔ سراپیا سے وہاں تک بھری جہاز کا سفر کوئی ممییز بھر کا ہے۔ دو عظیم سمندر، پانچ
آہنائیں اور ایک روڈ بار عبور کرنا پڑتے ہیں۔ ان دشوار مرحلوں سے گزر کر بھی خدا جانے، اس سے
ملاقات ہو یانہ ہو۔ میں کسی کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ جو
بھی ستا میر امداد اڑاتا اور مجھے پاگل قرار دے دیتا۔

ایک افواہ اور بھی سننے میں آئی کہ سات سمندر پار اس دو شیزہ کے لیے، ڈاک خانے میں
کبھی کھارا ایک خط موصول ہوا کرتا تھا جس میں اس سے شادی کی تمنا کی جاتی تھی۔ ان خطوط میں
سے کوئی بھی اپنی منزل تک نہیں پہنچا۔ میں بھی اگر دیوالی میں ایسی کوئی حرکت کر بیٹھتا تو اس کا بھی
وہ حشر ہوتا، ڈاک خانے والے، ایسے تمام خطوط اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔

میں اٹھارہ سال کا تھا اور وہ۔۔۔۔۔ دیوتاؤں کی محبوب۔۔۔۔۔ بھی میری ہم عمر تھی۔
ہم دونوں ہی 1880 میں پیدا ہوئے تھے۔ صرف پہلا عدد ڈنڈے کی طرح سیدھا تھا، باقی سب
گولائی میں تھے، نا تراشیدہ سنگ مرمر کی طرح۔ دن اور مہینہ بھی ایک ہی تھا۔ 31 اگست۔ فرق
تھا بھی تو گھنٹوں اور جنس میں تھا۔ میرے والدین نے میری پیدائش کا وقت نہیں نوٹ کیا تھا اور اس
کے پیدا ہونے کا وقت مجھے معلوم نہیں تھا۔ جہاں تک جنس کے فرق کا تعلق ہے۔ میں اڑکا تھا اور وہ
لڑکی تھی، اور جہاں تک زمان اور مکان کے پیچیدہ فرق کا تعلق ہے: جب میرا جزیرہ سیاہ چادر شب

میں مخواب ہوتا تھا تو اس کے علاقے میں سورج کی حکمرانی ہوتی تھی اور جب اس کی سر زمین رات کے اندر ہیروں سے بغل گیر ہو رہی ہوتی تو میرے شہروں پر خط استوا کا گرم سورج جگہ گراہا ہوتا۔

میری ٹپپر ماجدہ پیغمبر علم نجوم پر اعتقاد کا مذاق اڑایا کرتی تھیں۔ انہوں نے تھامس اکو نیاس کا واقعہ سنایا: اس نے ایک دفعہ دو ایسے آدمیوں کو دیکھا جن کی جائے پیدائش اور وقت پیدائش میں سر موافق نہ تھا۔ قسمت کا کھلیل دیکھیں: ایک شخص بہت بڑا میں دار بن گیا اور دوسرا اس کا غلام۔

خیر میں تو علم نجوم میں یقین ہی نہیں رکھتا۔ اس نے انسانی اور اک دا گھنی کی نشوونما میں کیا کردار ادا کیا ہے جو اس پر یقین کیا جائے؟ اگر اس کے ذریعے کی گئی پیش گوئیاں حق ہوتی ہیں تو پھر ہمارے کرنے کے لیے کیا رہ گیا۔ ایک فضول چیز میں تو کچھ رے خانے میں ڈال کر بھول جانا چاہیے۔ ایک دفعہ مذاق ہی مذاق میں میری قسمت کا حال بھی دیکھا گیا۔ بار بار میرزا چچہ بنایا گیا۔ پھر قسمت کا حال بتانے والی نے اپنی زبان یوں کھولی کہ اس کے منہ میں لگنے کے دو دانت بھی نظر آنے لگے:

"اگر آپ میں استقامت ہے تو وہ دو شیزہ یقیناً آپ کو ملے گی۔" ---- میں تو اپنی عقل پر زیادہ یقین کرتا ہوں۔ تمام دنیا کی استقامت بھی مل جائے تو یہ بات ناممکن ہے۔ میں سائنسی سمجھ بوجھ کا قائل ہوں۔ کم از کم انسان، اس طرح، واضح اور اک تو کر سکتا ہے۔

کرائے پر لیے ہوئے کمرے میں، اپنے کاؤچ پر بیٹھا، میں اس دو شیزہ دلوار کی تصویر میں گلن تھا۔ ناگہاں رابرٹ سر ہوف (میں یہاں اس کا اصلی نام استعمال نہیں کر رہا) دستک دیئے بغیر، دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ مجھے اس طرح بیٹھا دیکھ کر اس نے زور دار تھہہ لگایا، شرم اور گھبراہٹ کے مارے، میری آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ وہ بولا تو اس کے لمحے میں بلا کی کاٹ تھی۔ "اوہو، عورتوں کے رسیا، کسی کو چھوڑو گے بھی ہمارے رقبہ رو سیاہ لیکن چاند کے خواب دیکھنے کا فائدہ؟" جی تو چاہا، اسے اٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دوں مگر منہ سے صرف اتنا کلا:

"اوہ--- تمہیں کیا پتہ؟"

میں یہ بتاتا چلوں کہ وہ اپنے بی۔ ایس میں، میرا دوست تھا۔ قد میں مجھ سے نکلتا ہوا اور نسل اباظا ہر مقامی، مگر اس کی رگوں میں کس کس کا خون شامل تھا، یہ بات قدرت ہی بہتر جانتی ہے۔ "اسے تو بھول ہی جاؤ"۔ اس نے کہا۔ اس کی آواز میں تمثیر اور کمینہ پن، دونوں ہی جھلک رہے تھے۔ پھر گویا ہوا: "یہاں سراپیا میں بھی ایک دیوی ہے، تصور سے زیادہ خوبصورت، بس اس تصور سے ملتی جاتی ہی سمجھلو۔ یہ تو صرف ایک تصویر ہی ہے اور بس " وہ مجھے چڑا رہا تھا۔ میں وہ شخص تھا جس نے خوبصورتی کی تعریف کی تھی اور وہ میری کی ہوئی تعریف میرے ہی منہ پر مار رہا تھا۔ اس کے متناسب اعضاء، ہڈیوں کا ابھار، نرم و نازک شفاف جلد، جنمگاتی آنکھیں اور سرگوشی کے لیے تھرکتے ہوئے ہیں۔"

"تم نے اس میں، سرگوشی کرتے ہوئے ہوئے ہوئے، کا اضافہ کر کے، اسے بدل دیا ہے۔"

"ہاں، بے شک تمہارے لیے ان ہٹوٹوں پر گالیاں ہی کیوں نہ ہوں، وہ تمہیں اچھے ہی لگیں گے۔"

میں چپ رہا۔ اس نے مجھ پر چھپتی نظر ڈالی۔ "اگر تم مرد ہو، عورتوں کے اصلی ریاست ہمیں وہاں ضرور جانا چاہیے، دیکھیں تو سہی تمہارا کیا روایہ ہوتا ہے وہاں؟ تمہارے ہوئے ہوئے جس مردانگی کی چغلی کھاتے ہیں، وہ تم میں ہے بھی یانیں۔"

"مجھے تو ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔"

"اکھاڑے میں اترنے سے پہلے ہی ڈر گئے؟" اس نے طعنہ دیا۔ مجھے ایک دم طیش آ گیا۔ میں جانتا تھا کہ ڈچ سکول کا وہ ذہن۔۔۔ جو رابرٹ سر ہوف کے سر میں موجود تھا۔۔۔ لوگوں کی بے عزتی کرنے، تمثیر اڑانے، بدنام کرنے اور خباشت انگیزی میں واقعی بہت تیز تھا۔ وہ میری کمزوری سمجھ گیا: میری رگوں میں کوئی یورپی خون نہیں دوڑ رہا تھا۔

"ٹھیک ہے، چلیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ نیا تعلیمی سال شروع ہوئے، ابھی چند ہفتے ہی گزرے تھے اور اب سارے جاوا بلکہ شاید تمام ڈچ جزاں میں جشن منایا جا رہا تھا، ہر جگہ ہلینڈ کا قومی جھنڈا الہارہا تھا۔ اس کیتاے روزگار دو شیزہ، حسن کی دیوی، دیوتاؤں کی محبوبہ کی رسم تاج پوشی ادا کی جا رہی تھی۔ وہ اب میری ملکہ تھی اور میں اس کی رعایا۔ بالکل مس ماجدہ پیش رکی زبانی سنی ہوئی تھا میں اکونیا اس کی کہانی کی طرح یہ تھیں ملکہ معظمہ ول ہیمنا۔ پیدائش کے دن،

مہینے اور سال نے ستارہ شناسوں کو یہ موقع فرما ہم کیا تھا کہ انہیں تخت و تاج کا وارث بنادیں اور مجھے
نچلے درجے پر لے جا کر، ان کی رعایا میں سے ایک عام شخص۔ میری ملکہ کو تو شاید کبھی بھی یہ علم نہیں
ہو سکے گا کہ میرا بھی دنیا میں کوئی وجود ہے۔

جز اڑ میں جمعہ کا دن تھا اور 7 ستمبر ۸۹۸۱ کی تاریخ جبکہ ہالینڈ میں ابھی جمعرات تھی اور
ستمبر ۸۹۸۱ کی چھ تاریخ! سکولوں کے طلبہ جشن تاج پوشی کے ہنگاموں میں گم تھے: مقابلے،
جسمانی مہارت اور صلاحیتوں کے مظاہرے، فٹ بال کھیل، مداریوں کے کرتب اور والی بال
وغیرہ۔ مجھے ان میں سے کسی میں بھی دلچسپی نہیں تھی۔ کھیل مجھے پسندی نہیں تھے۔

میرے ارد گرد خوب چھپل پہل تھی۔ تو پوں کی سلامی کی گرج فضائیں گونج رہی تھی۔ مارچ
پاٹ کے ساتھ ملکہ کی عظمت کے نفعے بکھر رہے تھے۔ میرا دل خالی اور شکستہ تھا، چنانچہ میں
حسب عادت، اپنے پڑوئی اور کار و باری شرکیک جین میریز کے پاس جا دھمکا۔ جین فرانشی میں تھا،
ایک ٹانگ سے محروم، لیکن اس کی کہانی ذرا بعد میں آئے گی۔ اس نے فرانشی میں میرا خیر مقدم کیا
تاکہ میں بھی وہی زبان بولوں۔

"کاوا جین! تھوڑا سا کام ہے تمہارے لیے۔ ایک بیٹھ کے ساتھ رہائشی سوت بنانا
ہے۔ میں نے گاہک کی پسند کا ایک خاکہ اسے تھا دیا۔

"ماسٹر میکنی۔" برابر کے دروازے سے آواز آئی۔ میں نے کھڑکی سے باہر جھاہنک کر
دیکھا۔ میسر ٹانگ نے اپنا ہاتھ لہرا دیا۔

"جین! میں جا رہا ہوں، وہ غالباً مجھے کوئی کیک تھافتادینے آئی ہیں۔"

گھر آ کر مجھ کوئی کیک تو نظر نہیں آیا البتہ رابرٹ سر ہوف وہاں موجود تھا۔

"کیوں بھی، چل رہے ہو؟"

گیٹ کے سامنے ایک نی نویلی بگھی، ہماری منتظر تھی، ہمارے بیٹھتے ہی بگھی کے گھوڑے
حرکت میں آ گئے۔ کوچوان ایک بوڑھا جاوی تھا۔ "عام بگھیوں کے مقابلے میں اس کا کرایہ تو
خاصاً زیادہ ہوگا؟" میں نے ڈچ زبان میں پوچھا۔

"بے دوقونی کی باتیں نہ کرو، منکری۔ یہ کوئی عام بگھی نہیں، چار پہیوں والی ستی سی بگھی! اس
میں سپرنگ لگے ہوئے ہیں۔ سر ایسا میں اپنی قسم کی پہی بگھی ہے۔ بگھی کی تیاری پر اٹھنے والے تمام
خرج سے زیادہ قیمت تو صرف ان سپرنگس ہی کی ہوگی۔"

"مان لیا بھی، تم ٹھیک کہہ رہے ہو، اب بتاؤ راب، ہم جا کہاں رہے ہیں؟"

وہ اپنے مخصوص بے ہودہ، پر اسرار لجھ میں کہنے لگا: اس جگہ، جہاں جانے کی خواہش ہر نوجوان کے دل میں ہوتی ہے اس فرشتہ سیرت کی وجہ سے، سنا مکی۔ خوش قسمتی سے مجھے اس کے بھائی نے دعوت دی ہے۔ آج تک کسی اور کو یہ دعوت نہیں ملی سوائے اس کے۔ اس نے انگوٹھے سے اپنی جانب اشارہ کیا۔ "پتہ ہے، اس کے بھائی کا نام بھی رابرٹ ہے۔"

"اب تو بہت سے بچوں کے نام رابرٹ ہونے لگے ہیں۔۔۔۔۔" اس نے میری سنی ان سئی کردی اور بولتا رہا۔

"ہم دونوں کی ملاقات ایک فٹ بال تیچ کے دوران ہوئی تھی اور اب، اس نے مجھے دو پھر کے کھانے پر بلا یا ہے، پچھڑے کا گوشت مجھے بہت پسند ہے۔" اس نے انتہائی احمقانہ انداز میں مجھ پر ایک نظر ڈالی۔

"لیکن پچھڑے۔۔۔۔۔ میری سمجھ میں نہیں آیا۔"

"پچھڑے کا گوشت، پچھڑے کا گوشت لھانا، بہر حال یہ مسئلہ ہے اور تمہارا مسئلہ۔" اس نے چھٹا رالیتے ہوئے، اپنی آنکھیں مجھ پر گاڑ دیں۔ "رابرٹ کی وہ چھوٹی بہن ہے میں بھی تو دیکھوں تمہاری یہ مردانہ وجہت کہاں تک تمہارے کام آتی ہے، بڑے رسیا بنتے ہو عورتوں کے۔" بکھری جو نہیں ونو کروموکی جانب، بلاورن کے راستے کریگن سڑیٹ کی پھر لیلی سڑک پر مڑی، اس کے پہیوں کا آہنی فریم کھڑکھڑا نے لگا۔ "آ و بھی، گانا گاتے ہیں۔۔۔۔۔ میں آیا، اس میں نے دیکھا اور میں نے فتح کر لیا۔" اس نے پہیوں کی کھڑکھڑا ہٹ کے دوران، مجھے اکسانے کی بھرپور کوشش کی۔ "ارے، تمہارا تو بھی سے رنگ اٹھنے لگا۔ لگتا ہے، تمہیں بھی اپنی مردانگی پر یقین نہیں۔۔۔۔۔ ہاہاہا۔"

"تم یہ سب کچھ خود ہی لینے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔۔۔۔۔ پچھڑے کے گوشت کے ساتھ ساتھ وہ دیوی بھی۔۔۔۔۔؟"

"میں؟ بھی میں تو خالص یورپی دیوی کے سوا کچھ سوچ ہی نہیں سکتا!"
اچھا تو وہ دو شیزہ کوئی مخلوط انسل مقامی اڑکی ہی تھی۔ رابرٹ سر ہوف۔۔۔۔۔ ایک بار پھر آپ کو یاددا دوں کہ میں اس کا اصلی نام نہیں لے رہا۔۔۔۔۔ بھی جاوی تھا۔ اس کے ماں باپ بھی مقامی ہی تھے۔ رابرٹ کی پیدائش کے وقت اس کا باپ، اس کی ماں کو پیرا کہاں بر لے گیا

تھا، جہاں ایک بھری جہاز ہمیز کرک لنگر انداز تھا۔ اس کی ماں نے اسے، اسی جہاز پر جنم دیا، اس لیے اسے ڈچ شہریت کا حق دار سمجھا گیا، اس لیے اس کے دماغ میں یورپیت کا بھوت سوار تھا، مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ڈچ بھری جہاز پر پیدا ہونا، قانونی طور پر، کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا اور اس کا رو یہ غالباً رونم شہریت کے حامل یہودیوں جیسا لگتا تھا وہ خود کو اپنے ہی مقامی بھائیوں سے مختلف سمجھتا تھا۔ وہ ڈنی طور پر جادوی تھا ہی نہیں۔ البتہ، اگر وہ اس جہاز سے ایک کلو میٹر دور، پیراک کی بندرگاہ پر یا کسی اور میڈ ویس جہاز پر پیدا ہوا ہوتا تو شاید اس کا رو یہ خاص مختلف ہوتا۔ مجھے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی کہ وہ کسی اندھڑکی میں دلچسپی کیوں نہیں لیتا۔ وہ لا شعوری طور پر خود کو ڈچ شہری سمجھتا تھا اور اپنی آئندہ نسلوں کے مستقبل تک کے لیے سوچتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مستقبل میں ۔۔۔ مقامی باشندے تو خیر چیز کیا ہیں۔۔۔ مخلوط انسل اندھو شہریوں سے بھی زیادہ متمول اور ذی حیثیت ہو گا۔

وہ صبح کچھ زیادہ ہی سہا نی تھی۔ صاف سترے نیلے آسمان پر بادل کا نام و شان تک نہ تھا۔ نوجوانی میں تو ویسے ہی ہر طرف خوشی کا راجح محسوس ہوتا ہے۔ میری ہر کوش کامیابی سے ہم کنار ہو رہی تھی۔ تعلیمی معاملات میں کوئی مشکل تھی ہی نہیں۔ دلی اور ڈنی ابھی نہیں بھی نہیں تھیں۔ دل آئینے کی طرف شفاف تھا اور وہ جس کی تاریخ پوچھی ہوئی تھی؟ ظاہر ہے، یہ تو ہونا ہی تھا۔ عمارتوں اور ان کے دروازوں پر ساری سجاوٹ اسی کے لیے تھی، تمام سرکاری تقاریب اور اجتماعات اسی کے لیے ہو رہے تھے۔ دیتاوں کی مجبوبہ، آسمان سے اتری دیوی! اور یہ سر ہوف مجھے ایک ارضی لڑکی کے چکر میں ڈال کر، میرا مذاق اڑانا چاہتا تھا۔

انہی خیالوں میں گم، میں نے شہر کی جانب رواں دواں، دیہاتیوں کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا، زرد پتھریلی سڑک سیدھی و دنوں کرومو جاری تھی۔ مکانات، خشک کھیت، سر بزر میدان، سڑک کے ساتھ ساتھ ہانسوں کے بلند پالا درخت، تاحد نظر پھیلے گئے جنگلات اور ان پر سورج کی روپہلی کرنوں کی لگاتار بارش، یہ سب کچھ چشم زدن میں گزرتا چلا گیا: دور پیس منظر میں فلک بوس مگر خاموش پتھریلی چٹانوں کا دھنڈ لایا ہوا سلسلہ کوہ، گیان دھیان میں مصروف کسی سینا سی کے بت کی مانند۔

"نہیں، میں نے کہانا، میں صرف کھانا کھانے جا رہا ہوں اور تم اسے مسخر کرنے۔"

"ہم جا کہاں رہے ہیں؟"